Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 02, December 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 25th September, 2025 | Accepted: 12th December, 2025 | Available Online: 31st December, 2025
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v17i02.433

اردو ادب میں استعمار اور رد استعمار: ایک ادبی پس منظر

Colonialism and Post-Colonial Resistance in Urdu Literature: A Literary Context

DR. SYED ZAHID HUSSAIN KAZMI
Vice Principal, Islamabad Model College for Boys, I-10/1, Islamabad, Pakistan
(zahidkazmihsp@gmail.com)

CONFLICT OF INTEREST: The author declares that there are no conflicts of interest related to the research, authorship, and/or publication of this article, and that the data presented have not been fabricated or falsified.

FUNDING: This research did not receive any specific grant or financial support from public, commercial, or not-for profit funding agencies.

PARTICIPANT CONSENT: The author confirms that Informed consent was obtained from all participants, and confidentiality was duly maintained.

KEYWORDS: Urdu literature, Colonialism, Postcolonialism, Identity, Resistance, Reformist Thought, Cultural Sovereignty, Decoloniality, Neo-colonialism, Colonial modernity

ABSTRACT: Urdu literature holds a central place in the intellectual and cultural history of South Asia, serving as a vital site of colonial and postcolonial discourse. During colonial rule, it was shaped by Western modernity, rationalism, and reformist narratives, while simultaneously engaging with questions of identity, freedom, and resistance. Postcolonial theorists such as Edward Saeed, Homi Bhabha, Gayatri Spivak, and Frantz Fanon exposed the cultural and psychological dimensions of empires. It offers insights that resonate with Urdu reformists like Sir Syed Ahmad Khan, Shibli Nomani, Hali, and Deputy Nazir Ahmad, who sought moral and social renewal. Muhammad Iqbal, however, went further by directly challenging colonial power and transforming anti-colonial thought into a spiritual and intellectual movement. After independence, Urdu literature continued to nurture ideals of selfhood, freedom, and cultural sovereignty, evolving into both an aesthetic tradition and a record of resistance. This study brings together the concepts of colonialism, postcolonialism, neo-colonialism, and decoloniality to clarify their intellectual and critical significance for understanding Urdu literature within broader global debates on power, culture, language, memory, and historical consciousness today identity resistance.

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-Non Commercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

اردو ادب برصغیر کی اجتماعی زندگی کا ایسا معتبر حوالہ ہے جو نہ صرف جمالیاتی اظہار کا ذریعہ رہا بلکہ سیاسی، سماجی اور فکری شعور کی تشکیل میں بھی بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ برطانوی استعمار کے عہد میں ادب کے اندر دوہرا شعور نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف نوآبادیاتی فکر کے اثرات، جدیدیت کی مرعوبیت اور مغربی اقدار کی طرف جھکاؤ نظر آتا ہے تو دوسری جانب اسی کے رد عمل میں

مزاحمت، آزادی کی جستجو اور اپنی تہذیبی و قومی شناخت کی بازیافت کا عمل بھی شروع ہوتا ہے۔ استعمار نے محکوم اقوام کو فکری و لسانی سطح پر بھی زیرِ اثر رکھنے کے لیے علمی اور ادبی ذرائع کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ جس کے نتیجے میں اردو ادب میں استعماری فکر کی بازگشت سنائی دینے لگی لیکن یہی رجحان آگے چل کر رَدِ استعمار کے بیانیے کو جنم دیتا ہے۔ اکبر، حالی اور اقبال جیسے مفکرین کی فکری تحریک سے جڑ کر محکوم ذہن کو خودی، خوداعتمادی اور آزادی کی جستجو کی طرف مائل کرتا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے ادیبوں اور شعرا نے نہ صرف نو آبادیاتی بیانیوں کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ اپنے فن کے ذریعے مقابلہ بھی کیا یہی وجہ ہے کہ اردو ادب ایک ایسا تخلیقی سے وسیلہ بن گیا جس کے ذریعے استعمار زدہ نے اپنی تہذیبی، لسانی اور فکری شناخت کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد کی۔ اس طرح اردو ادب محض تخلیقی اظہار نہیں بلکہ استعمار اور رَدِ استعماریت کے بیانیوں کا تجزیاتی مطالعہ فراہم کرتا ہے جو برصغیر کی فکری و تہذیبی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔

استعمار اور ادب کے باہمی رشتے کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ادب صرف فنونِ لطیفہ کا حصہ نہیں بلکہ معاشرے کی فکری و تہذیبی شعور کا مظہر بھی ہوتا ہے۔ جب کوئی طاقتور قوم کمزور معاشرے پر تسلط قائم کرتی ہے تو اس کے اثرات صرف سیاسی و معاشی نہیں رہتے بلکہ زبان، فکر، معاشرت اور ادبی اظہار کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ برصغیر کے نو آبادیاتی دور میں یہی کچھ ہوا جہاں برطانوی اقتدار نے اردو ادب کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالا کہ جس میں استعمار کے اثرات اور مقامی رد عمل دونوں نظر آتے ہیں۔ اس ماحول میں اردو ادب کے تخلیق کار دو بڑے رویوں کے ساتھ سامنے آئے۔ ایک وہ رویہ تھا جو نو آبادیاتی طاقتوں کے اثر کو قبول کر کے مسلمانوں کو جدید تعلیم، سائنسی فکر اور عقلی رویوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کوشاں تھے اور دوسرا رویہ وہ جو اس فکری یلغار کے خلاف مزاحمت میں مصروف کار تھے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں برصغیر کا ادبی منظر نامہ اس بات کا گواہ ہے کہ استعمار کے سیاسی تسلط نے صرف معیشت اور سیاست کو متاثر نہیں کیا بلکہ اس نے اردو ادب پر فکری اور تہذیبی اثرات مرتب کئے۔ نو آبادیاتی نظام نے معاشرتی ڈھانچوں کو بدلا اور ادبی تخلیقات کو بھی ایک نئے تناظر سے ترتیب دیا گیا۔ جس کے رد عمل میں اردو کے شاعروں، ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں نے اپنی تحریروں میں استعماریت کے خلاف مزاحمت اور مقامی شناخت کی بازیافت کا بیانیہ تشکیل دیا اور یہی وجہ ہے کہ استعماریت کے زیرِ سایہ اردو ادب میں تہذیبی تصادم، استعمار کے خلاف ردِ عمل اور شناخت کے بحران جیسے موضوعات بار بار سامنے آتے رہے اور انہوں نے اردو ادب کو ایک نئی فکری سمت عطا کی۔ اس لئے استعمار کے فکری پہلو کو سمجھنے کے لیے مغربی ناقدین اور مفکرین کی خدمات نہایت اہم ہیں۔ نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات نے طاقت، ثقافت، زبان اور شناخت جیسے پہلوؤں کو نئی معنویت دی۔ ایڈورڈ سعید کی اورینٹلزم تھیوری (Orientalism Theory) اس حقیقت کو عیاں کرتی ہے۔ ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

> "شرق شناسی ایک جغرافیائی فرق کی تشریح و توضیح ہے۔... یہ پھیلاؤ ایک خواہش اور ارادہ سے بھی عبارت ہے جو صرف اظہار کا محتاج نہیں بلکہ اس کا مقصد ایک مختلف دنیا کو سمجھنا اور بیشتر صورتوں میں اس پر تسلط قائم کرنا"(۱)

شرق شناسی مشرقی خطوں کا جغرافیائی مطالعہ اور ایک ایسی حکمت عملی ہے جس میں اس کا دائرہ کار مشرق کے بارے میں صرف معلومات فراہم کرنے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے پس منظر میں ایک خاص مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔یعنی مشرق کو اپنی تعبیر کے مطابق قابو میں لا کر اس پر اثر انداز ہونا ہے۔اس طرح شرق شناسی کو ایک ایسا عمل کہا جاسکتا ہے جس میں مشرقی دنیا کا غیر جانب دار جائزہ لینے کی بجائے اسے اپنی طاقت، نظریات اور مفادات کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔یہ صرف ثقافتی یا جغرافیائی فرق کی وضاحت نہیں کرتی بلکہ ایک سیاسی اور فکری حکمتِ عملی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔یہ تناظر اردو ادب کے مطالعے میں خاص اہمیت رکھتا ہے جہاں انیسویں صدی کے ادیبوں کی تحریروں میں استعماریت کے بیانیے اور اس کے رد عمل کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔

ہومی کے بھابھا(Homi k. Bhabha) کے تصورات تہذیبی اختلاط (Hybridity) ، تقلیدی رویہ (Mimicry) اور دو جذبیت (Ambivalence) نو آبادیاتی تعلق کو صرف طاقت کا یک طرفہ اظہار نہیں مانتیں بلکہ اسے ایک تہذیبی مکالمہ اور ثقافتی آمیزش بھی سمجھتی ہیں۔استعمار زدہ غالب ثقافت کی تقلید کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر استعمار کی بنیادوں کو متزلزل کرتے ہیں کیونکہ شناخت جامد نہیں بلکہ مسلسل بدلتی رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مقامی اور مغربی شناخت کے ملاپ سے ایک نیا ثقافتی ڈھانچہ ابھرتا ہے۔دوسری جانب گائتری اسپواک(Gyatri Chakravorty Spivak) کی سبالٹرن تھیوری(Subaltern Theory) کے حوالے سے ان کی مشہور تنقیدی کتاب (Can the Subaltern Speak) یہ سوال اٹھاتی ہے کہ محکوم اور پسماندہ طبقات اپنی کہانی خود بیان کرنے کے قابل ہیں یا یہ حق بھی ان سے چھین کر دوسروں کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے۔اس طرح یہ تھیوریز اس نکتے پر متفق ہیں کہ نو آبادیاتی بیانیہ محض جبر نہیں بلکہ ایک پیچیدہ اور متحرک عمل ہے جس میں مقامی آواز کو دبانے کے ساتھ ساتھ نئی شناختی صورتیں بھی ابھرتی ہیں۔

اسی فکری تسلسل میں فرانز فینن(Frantz Fanon) کی ڈی کالونئیلزم تھیوری(Decolonialism Theory)اس بات پر زور دیتی ہے کہ آزادی محض سیاسی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسیاتی سطح پر بھی ضروری ہے تاکہ محکوم اقوام اپنی کھوئی ہوئی شناخت بحال کر سکیں۔اسی نظریہ سے متمسک ایک نظریہ ردِاستعماریت ہے۔یہ نظریہ مقامی زبان، ثقافت اور روایات کے احیاء کو سامراجی اثرات کے متبادل کے طور پر پیش کرتا ہے۔انحصاری نظریہ (Dependency Theory) ایندرے جیندر فرینک (Andre Gunder Frank)اور فرنینڈو ہنرک کارڈوسو(Fernando Henrique Cardoso) نے پیش کیا۔یہ استعمار کے اس پہلو کو اجاگر کرتا ہے کہ استعمار نے ترقی پذیر ممالک کو ایک ایسے معاشی جال میں جکڑ دیا جس نے انہیں ترقی یافتہ ممالک پر انحصار کرنے پر مجبور کیا۔ایک اور نظریہ مابعد نو آبادیاتی نسوانیت کی تھیوری(Postcolonial Feminist Theories) ہے جسے چندرا ٹلپیڈ موہانٹے (Chandra Talpade Mohanty) اور دیگر مفکرین نے دیا۔یہ مغربی نسوانیت پر تنقید کرتی ہے اور کہتی ہے کہ عورتوں کے مسائل کو ان کے مقامی، ثقافتی اور طبقاتی تناظر میں سمجھنا ضروری ہے کیونکہ یہ دوہری غلامی کا شکار ہیں۔یہ تمام نظریات ردِاستعماریت کے تصور سے جڑے ہوئے ہیں جو صرف سیاسی آزادی نہیں بلکہ فکری، ثقافتی اور تہذیبی خود مختاری کو بھی ناگزیر سمجھتا ہے۔یہ تمام نظریات نو آبادیاتی ڈھانچوں کے خاتمے اور فکری آزادی کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ایڈورڈ سعید نے اپنی شہرہ آفاق کتاب شرق شناسی

(Orientalism) میں یہ واضح کیا کہ مشرق کو مغرب نے ہمیشہ ایک "غیر" کے طور پر پیش کیا تاکہ وہ اپنی برتری قائم رکھ سکے۔ ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

> "کسی بڑے مغربی ملک کی سیاسی طاقت، نو آبادیاتی پالیسی، علمی برتری اور تمدنی طاقت نے (جیسا کہ مروجہ علوم از قسم زبانوں کا تقابلی مطالعہ (تقابل لسانیات) یا موجودہ دور میں پالیسی پر اثر انداز ہونے والے علوم یا تمدن کی طاقت کا یہ نقطہ نظر کہ "ہم" کیا کرتے ہیں یا "وہ" کیا نہیں کر سکتے اور کیا نہیں سمجھ سکتے جیسا کہ "ہم" سمجھتے ہیں اور کرتے ہیں)"(۲)

مغربی طاقتوں نے نو آبادیاتی پالیسی کے ساتھ علمی اور تہذیبی برتری کو ہتھیار بنایا۔ انہوں نے تقابلِ لسانیات اور جدید علوم کے ذریعے مشرق کو اپنی نظر سے پرکھا اور اسے پسماندہ ظاہر کیا۔ اس عمل میں "ہم" کو ترقی یافتہ (استعمار) اور عقل مند جبکہ "وہ" کو کمزور اور ناقص فہم (استعمار زدہ) بنا کر پیش کیا گیا تاکہ اپنی حکمرانی کو جائز ٹھہرایا جا سکے۔ جب ہم انیسویں صدی کے مسلم ادیبوں کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو نو آبادیاتی بیانیے کے اثرات اور ان کے رد عمل میں مقامی کوششیں واضح دکھائی دیتی ہیں۔ دوسری جانب استعماریت صرف طاقت کا یک طرفہ اظہار نہیں بلکہ یہ "تہذیبی مکالمے" اور "ثقافتی آمیزش" کا عمل تھا۔ اس بارے سی ایل انس لکھتے ہیں:

> "Like Said and Spivak, Bhabha celebrates the 'hybridity' of postcolonial cultures."
>
> "سعید ، اسپواک اور بھابھا بھی مابعد نو آبادیاتی ثقافتوں میں موجود تہذیبی آمیزش (Hybridity) کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔" (۳)

اردو ادب میں یہ رجحان اس وقت زیادہ نمایاں ہوتا ہے جب ہم انگریزی ادبی اثرات اور مقامی مزاحمتی رویوں کے امتزاج کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس طرح ایڈورڈ سعید اور ہومی کے بھابھا دونوں کے نظریات اردو ادب کو سمجھنے کے لیے ایک تنقیدی بنیاد فراہم کرتے ہیں جس کے ذریعے ہم استعماریت کو صرف سیاسی نہیں بلکہ تہذیبی اور فکری کشمکش کے طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ برطانوی استعمار نے اردو زبان و ادب میں وہ تغیرات پیدا کیے جو اس سے قبل اردو روایت میں موجود نہیں تھے۔ انگریزی نظامِ تعلیم کے نفاذ نے اردو زبان کو نئی فکری جہات عطا کیں اور ادب کو نئے سانچوں میں ڈھالا۔ اس دور میں اردو ناول، افسانہ، ڈرامہ اور مضمون جیسی اصناف متعارف ہوئیں اور جلد ہی انہوں نے مقبولیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ انگریزی نظام تعلیم اور یورپی فکری سانچوں نے اردو ادب کو نئے رخ پر ڈالا۔ کلاسکی شعری روایت کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ جنہوں نے ادب کو حقیقت نگاری اور معاشرتی تنقید کی سمت لے جانے میں مدد دی۔ نو آبادیاتی پس منظر نے ادبی تخلیقات کو نئے سوالات سے ہمکنار کیا تاہم اس کے ساتھ مزاحمت کا رجحان بھی پروان چڑھتا گیا۔ نو آبادیاتی دور کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اردو زبان اور اس کی ادبی اصناف پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

آزادی کے بعد اردو ادب میں رد استعماریت کا شعور مزید گہرا ہوا اور یہ احساس پیدا ہوا کہ استعماریت کو صرف سیاسی تسلط تک دیکھنا کافی نہیں بلکہ اس کے فکری، ثقافتی اور لسانی اثرات کا بھی تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ بڑے بڑے ادیبوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے نو آبادیاتی ورثے کے نتائج کو بیان کیا۔ ان کی تحریروں میں شناخت کا بحران، تہذیبی زوال اور تاریخی شعور کی بازیافت جیسے موضوعات نمایاں رہے۔ رد استعماریت نے اردو کے تخلیق کاروں کو یہ شعور دیا کہ مقامی تاریخ اور زبان کو نئی معنویت کے ساتھ پیش کرنا ہی استعمار کے فکری تسلط کا اصل جواب ہے۔ اردو ادب میں رد استعماری بیانیہ صرف نو آبادیاتی ذہنیت کو بے نقاب کرنے تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک مثبت عمل بھی ہے جس کے ذریعے ادیبوں نے اپنی تہذیبی و ادبی شناخت کو از سرِ نو مرتب کیا اور اس مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اردو ادب کا فکری سفر مزاحمت، خود آگاہی اور آزادی کی جستجو پر مبنی ہے۔ استعماریت نے اگر ذہنی غلامی پیدا کی تو رد استعماریت نے اس غلامی کے خلاف بیداری اور مزاحمت کو ممکن بنایا۔ اس پہلو نے اردو ادب کو ایک جمالیاتی روایت کے ساتھ ایک فکری اور سیاسی جدوجہد سے جوڑا جو محکوم ذہنوں کو آزادی، خودداری اور ثقافتی بازیافت کا پیغام دیتی ہے۔

بیسویں صدی کے وسط میں جب استعماری ڈھانچے ٹوٹنے لگے تو رد استعماریت بطور ایک فکری و تنقیدی تحریک سامنے آئی۔ اس کا مقصد صرف سیاسی آزادی کا اعلان نہیں بلکہ ذہنی اور تہذیبی بالادستی سے نجات بھی تھا۔ فرانز فینن لکھتے ہیں:

> "یہ اسلوب دست بدست جدوجہد کا اظہار کرتا ہے اور اس ضرورت کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان خود اپنی ذات کے اس حصے سے آزاد ہوتا ہے جو اپنے اندر انحطاط کے بیج لئے ہوئے ہے۔"(۴)

نو آبادیاتی غلامی صرف سیاسی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسیاتی جبر بھی تھی۔ اس جدوجہد میں انسان کو بیرونی طاقت کے ساتھ اپنی اندرونی کمزوری، غلامانہ سوچ اور احساسِ کمتری سے بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اصل آزادی تب مکمل ہوتی ہے جب فرد اپنے دل و دماغ کو شکست خوردگی سے آزاد کرے اور اپنی خود اعتمادی و طاقت بحال کرے۔ یہ رد استعماریت کا رویہ آہستہ آہستہ پنپنے لگا اور آخر کار اپنی منزل کی طرف گامزن ہوا۔

1857ء کی جنگِ آزادی برصغیر کی تاریخ ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے ارتقائی سفر میں ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سانحے کے بعد مسلمانوں کو سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر شدید زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریز حکمرانوں نے بغاوت کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال کر انہیں اقتدار سے محروم کرنے کے ساتھ معاشی طور پر کمزور کیا اور تعلیمی میدان میں ان کی ترقی کو دانستہ طور پر روکا۔ انگریزی زبان اور مغربی اقدار کو برتر قرار دے کر اردو اور مقامی تہذیب کو پس منظر میں دھکیل دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر ایک ذہنی خلا اور فکری انتشار پیدا ہوا۔ یہی وہ حالات تھے جن میں اردو ادب محض تخلیقی اظہار تک محدود نہ رہا بلکہ فکری رہنمائی اور اصلاحی کردار ادا کرنے لگا۔ سرسید تحریک اور بعد کی ادبی و تعلیمی تحریکیں اسی بحران کا ردِ عمل تھیں جنہوں نے مسلمانوں کو ایک نئے فکری، تہذیبی اور سماجی شعور کی طرف متوجہ کیا۔ آزادی کے بعد اردو ادب نے مزید ترقی کرتے ہوئے رد استعماری بیانیہ اختیار کیا جو صرف سیاسی آزادی کے حصول تک محدود نہیں تھا بلکہ نو آبادیاتی ورثے کے دیرپا لسانی، فکری اور تہذیبی اثرات پر بھی تنقیدی نگاہ رکھتا تھا۔ جس نے استعمار کو محض سیاسی غلبے کے طور پر دیکھنے کی بجائے اس کے نفسیاتی، تہذیبی اور لسانی پہلوؤں کو بے نقاب

کیا جس سے ادب احتجاج کا ذریعہ نہ رہا بلکہ ایک نئے فکری تناظر میں ڈھل گیا۔ اس مرحلے پر اردو ادب نے مقامی شناخت کی بازیافت، تاریخی شعور کی تجدید اور ثقافتی احیاء کو اپنا بنیادی ہدف بنایا جس کے باعث وہ نہ صرف تنقیدی قوت سے ہمکنار ہوا بلکہ عالمی سطح پر بھی مابعد نو آبادیاتی مطالعات میں ایک اہم حوالہ بن گیا۔ اس طرح 1857ء کے بعد کے ادبی رجحانات نے اردو ادب کو محض جمالیاتی اظہار کی بجائے اصلاحی، فکری اور تہذیبی بیداری کا ایک مؤثر ذریعہ بنا دیا۔

انیسویں صدی کے سیاسی و سماجی حالات نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک بڑے بحران سے دوچار کیا۔ ان حالات میں سر سید احمد خان نے یہ موقف اختیار کیا کہ انگریزوں کی مخالفت کی بجائے ان کے ساتھ تعاون مسلمانوں کے لیے زیادہ سود مند ثابت ہو گا۔ ان کا خیال تھا کہ قوم کی ترقی کی واحد راہ جدید تعلیم، سائنسی رویہ اور انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنے میں پوشیدہ ہے۔ انہوں نے اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق " کے ذریعے مسلمانوں میں اخلاقی اعتدال، مذہبی رواداری اور سماجی اصلاح کا پیغام عام کیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی مشہور تصنیف "اسبابِ بغاوتِ ہند " میں انہوں نے انگریزوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ بغاوت 1857ء میں مسلمان بحیثیت قوم کسی منظم انداز میں شریک نہیں تھے۔ بظاہر یہ طرزِ فکر استعمار سے مصالحت کی نشاندہی کرتی ہے مگر درحقیقت اس کے پسِ پشت مقصد مسلمانوں کو برطانوی حکومت کی سختیوں سے بچانا اور انہیں ترقی کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔ سر سید کی اصلاحی تحریک نے اردو ادب میں مقصدیت اور حقیقت پسندی کو فروغ دیا۔ ان کی تحریروں میں مغربی سائنسی طرزِ استدلال اور عقلی رویہ نمایاں ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو نثر میں منطق، دلیل اور سماجی شعور مغربی اثرات کے تحت پروان چڑھا۔ بعد ازاں اسی سوچ کو عملی بنیاد فراہم کرنے کے لیے انہوں نے علی گڑھ تحریک کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو جدید علوم کی طرف راغب کیا تاکہ وہ نو آبادیاتی نظام کے چیلنجز کا بہتر طور پر سامنا کر سکیں۔ سر سید احمد خان کا یہ یقین تھا کہ برطانوی اقتدار کو چیلنج کرنا ناممکن ہے اس لیے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ نئے سیاسی و سماجی حالات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کریں۔ وہ قدامت پرستی اور روایتی جمود کو مسلمانوں کی زبوں حالی کا سبب سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ انگریزی زبان و ادب، جدید تعلیم اور سائنسی فکر کے سب سے بڑے داعی بنے۔ اگرچہ ان کی پالیسی پر ناقدین نے اعتراض کیا کہ یہ رویہ نو آبادیاتی تسلط کو مزید تقویت دیتا ہے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سر سید کی فکر نے برصغیر کی مسلم اشرافیہ کو ایک نئی سمت عطا کی۔ علی گڑھ تحریک نے نہ صرف مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کی بلکہ اردو ادب کو بھی حقیقت پسندی، مقصدیت اور جدیدیت کے نئے رجحانات سے روشناس کرایا۔

ڈپٹی نذیر احمد اردو ناول نگاری کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے عہد کے سماجی اور اخلاقی مسائل کو نہایت عمدگی سے بیان کیا۔ ان کے ناول "مراۃ العروس" ,"توبۃ النصوح " اور "ابن الوقت " خاص طور پر متوسط طبقے کی اصلاح اور گھریلو زندگی کے نظام کو موضوع بناتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ نو آبادیاتی دور میں مغربی اقدار اور معاشرتی سانچوں کو اپنائے بغیر ترقی کا تصور ممکن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے کردار اس نئے نو آبادیاتی معاشرتی ڈھانچے میں اپنی جگہ بنانے کی جستجو کرتے ہیں لیکن اسی جدوجہد کے دوران اپنی تہذیبی اور دینی شناخت کے بحران کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ ان ناولوں میں یہ پہلو واضح ہے

کہ استعمار نے نہ صرف سیاسی اور معاشی سطح پر بلکہ فکری و سماجی سطح پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاحِ معاشرہ کو پیش کرتے ہوئے یہ دکھایا کہ نو آبادیاتی اثرات کے باوجود روایت اور اخلاقیات کی پاسداری کو کس طرح زندہ رکھا جا سکتا ہے۔

اردو ادب میں اصلاحی رجحانات کے نمایاں نمائندہ الطاف حسین حالی ہیں جن کی شہرۂ آفاق نظم مسدس "مدو جزرِ اسلام" مسلم سماج کے زوال اور اس کے اسباب کی نہایت مؤثر انداز میں نمائندگی کرتی ہے۔ اس نظم میں حالی نے مسلمانوں کی پسماندگی کا تقابل مغرب کی ترقی اور علمی برتری کے ساتھ کیا اور مغربی علوم و اقدار کو بطور نمونہ پیش کرتے ہوئے اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ مسلم معاشرے کی بقا جدید تعلیم اور فکری بیداری میں مضمر ہے۔ حالی کی تحریروں میں ایک پہلو یہ بھی نمایاں ہے کہ جدیدیت کے حصول کی جدوجہد میں مسلمان اپنی تہذیبی میراث سے فاصلہ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس نظم میں جہاں مسلمانوں کے ماضی کی عظمت کا نوحہ ملتا ہے تو وہیں ایک واضح پیغام یہ بھی دیا گیا ہے کہ اخلاقی اصلاح، علمی ترقی اور عصری شعور کو اپنائے بغیر قوم کی بحالی ممکن نہیں۔ اس طرح حالی کی اصلاحی فکر براہِ راست نو آبادیاتی فکری و تہذیبی اثرات سے مرتبت دکھائی دیتی ہے۔

شبلی نعمانی بھی برصغیر کے مسلمانوں کی فکری اور تہذیبی بیداری کے نمایاں ترجمان تھے۔ حالی اور شبلی دونوں کی تنقید اس رجحان کی آئینہ دار ہے جو برصغیر کے زوال پذیر مسلم معاشرے کو علمی و اخلاقی پسماندگی سے نکالنے کے مقصد سے پروان چڑھا۔ شبلی کی تحریروں میں عقلیت پسندی، حقیقت نگاری اور اخلاقی اصلاح پر خاص زور ملتا ہے۔ شبلی کی تصنیف "المامون" میں عباسی دور کے علمی و فکری ارتقاء کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی ترقی ہمیشہ علم، تحقیق اور تہذیبی بیداری کے ساتھ منضبط ہے اور جب یہ عناصر کمزور پڑے تو زوال نے گھیر لیا۔ اسی طرح "سیرۃ النعمان" میں شبلی نے امام ابو حنیفہ کی شخصیت اور فکر کو اجاگر کرتے ہوئے یہ باور کرایا کہ مسلمانوں کی فکری و تہذیبی زندگی کی اصل طاقت ان کے علمی ورثے اور اجتہادی فکر میں مضمر ہے۔ ان تخلیقات میں یہ پہلو بھی نمایاں ہے کہ شبلی نے مسلمانوں کو جدید تعلیم اور مغربی علوم اپنانے کی ضرورت پر تو زور دیا لیکن ساتھ ہی اس خطرے کی نشاندہی بھی کی کہ اگر قوم نے اپنی تہذیبی اور فکری بنیادوں سے انحراف کیا تو اس کا وجود مزید کمزور ہو جائے گا۔ شبلی کی فکر ایک طرف نو آبادیاتی دباؤ کے تناظر میں جدیدیت کی طرف مائل اور دوسری طرف اپنی تہذیبی میراث کے تحفظ کی علامت ہے۔ یہی امتزاج ان کی تنقید اور اصلاحی تحریروں کو اردو ادب میں ایک خاص مقام عطا کرتا ہے۔ اردو شاعری میں مرثیہ اور شہر آشوب استعمار اور ردِ استعماریت کے گہرے استعارے ہیں۔ مرثیہ میں واقعۂ کربلا جو کہ ایک مذہبی حادثہ نہیں بلکہ ظلم و جبر، اقتدار اور سامراجی تسلط کے خلاف روحانی و اخلاقی مزاحمت کی علامت ہے۔ میر انیس کے ہاں حسینؑ کی قربانی حق، انصاف اور انسانی وقار کی جدوجہد کے طور پر نظر آتی ہے جو ہر دور کے استعمار کے خلاف ایک اخلاقی بیداری کا سرچشمہ بنتی ہے۔ مرثیہ اس مزاحمت کی علامتی زبان ہے جس نے برطانوی استعمار کے دور میں قوم کو شعور، حوصلہ اور امید عطا کی۔ شہر آشوب تہذیبی زوال اور معاشی محرومی کے بیچ بقا اور مزاحمت کا شعری اظہار ہے۔ یہ صنف شکست و تباہی کے منظر نامے میں بھی شعور و امید کے استعاروں کو زندہ رکھتی ہے۔ مابعد نو آبادیاتی تناظر میں مرثیہ اور شہر آشوب صرف فنی یا جذباتی اصناف نہیں بلکہ فکری مزاحمت، اجتماعی شناخت اور اخلاقی استقامت کے نمائندہ بیانیے ہیں۔ ان میں فن غمگساری نہیں بلکہ ایک ایسا شعوری احتجاج ہے جو انسان کو استعمار کی ذہنی و مادی غلامی سے نجات اور اپنی خودی کی بازیافت کی طرف متوجہ

کرتا ہے۔ مرثیہ ظلم کے مقابل حق کی ابدی فتح کا استعارہ بن جاتا ہے اور شہر آشوب زوال کے اندھیرے میں امید اور بقا کا چراغ روشن کرتا ہے۔ دونوں اصناف اردو شاعری میں استعمار کے خلاف فکری مزاحمت، تہذیبی خودی اور منصفانہ دنیا کے خواب کا روشن تمثیلی اظہار ہیں۔ میر انیس ظلم کے خلاف مزاحمت اور اخلاقی استعمار شکن استعارہ لکھتے ہیں:

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد(۵)

میر انیس کا یہ شعر استعمار کے خلاف اخلاقی و روحانی مزاحمت کا استعارہ ہے جو حق و باطل کی دائمی جدوجہد کو علامتی سطح پر ظاہر کرتا ہے۔

جو سر کٹا تو یہ سمجھا کہ کام ہو گزرا
مگر یہ خون نہ رکتا تھا دشتِ کرب و بلا میں(۶)

میر انیس کا یہ شعر قربانی کے تسلسل اور ظلم کے خلاف دائمی احتجاج کی علامت ہے جو استعمار مخالف شعور سے جڑا ہوا ہے۔

اکبر الہ آبادی کی رباعی برطانوی استعمار پر گہری سیاسی و فکری طنز ہے جس میں شاعر نے ہندوستان کے مذہبی، ثقافتی اور معاشی استحصال کو نمایاں کیا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کو آشکار کیا کہ سامراج نے ہندوستان کو اپنی تجارت اور طاقت کے ایک مرکز میں بدل دیا ہے۔ اکبر طنزیہ پیرائے میں بتاتے ہیں کہ یہ سرزمین نہ دارالاسلام رہی اور نہ ہی رام و لچھمن کا وطن رہا۔ اب یہ صرف یورپ کا گودام بن چکی ہے۔ اس علامتی اظہار میں استعمار کی وہ ذہنیت بے نقاب ہوتی ہے جو قوموں کو روحانی اور مادی سطح پر غلام بنانے کا ہنر رکھتی ہے۔ اکبر کا طنز وقتی سیاست نہیں بلکہ فکری بیداری کا استعارہ ہے۔ ان کے نزدیک نو آبادیاتی غلبہ صرف زمینوں کا نہیں بلکہ ذہنوں کا قبضہ ہے جو ہندوستانی شناخت کے زوال کی اصل بنیاد بنا۔ ان کی شاعری اردو ادب میں استعمار اور ردِ استعمار کے درمیان فکری مزاحمت کی ایک مؤثر آواز ہے جس میں بیداریِ شعور، قومی خودداری اور تہذیبی وقار کا گہرا احساس جھلکتا ہے۔ وہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کے خلاف شعوری احتجاج کرتے ہیں اور برصغیر کے انسان کو اپنی فکری خودی کی بازیافت کی دعوت دیتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں:

یہ بات غلط کہ دار الاسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملک لچھمنؔ و رامؔ ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش
یورپ کے لیے بس ایک گودام ہے ہند(۷)

ان کا ایک اور شعر ہے:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام،
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا(۸)

اسی طرح ان کا مشہور شعر:

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ،

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 02, December 2025

رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ(۹)

استعماری نظام اور مقامی منافقت دونوں پر طنز ہے۔ اس میں اکبر نے ان نام نہاد قومی رہنماؤں پر تنقید کی ہے جو استعماری نظام کے ساتھ مفاہمت اختیار کر لیتے ہیں۔

اقبال کی شاعری استعمار کے خلاف اردو ادب میں فکری مزاحمت کی سب سے بلیغ اور مؤثر آواز کے طور پر ابھرتی ہے۔ ان کے ہاں مزاحمت کا تصور صرف سیاسی آزادی کی جدوجہد تک محدود نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت فکری، روحانی اور تہذیبی بیداری کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اقبال نے محکوم اقوام کے دل و دماغ کو بیدار کرنے کے لیے "تصورِ خودی" کو بنیاد بنایا جو فرد کو اس کی باطنی قوت، فطری صلاحیتوں اور اجتماعی ذمہ داری کا شعور عطا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک استعمار نے مسلمانوں کو صرف سیاسی محکومی تک محدود نہیں رکھا بلکہ انہیں فکری، تہذیبی اور روحانی سطح پر بھی کمزور کر دیا ہے۔ اقبال کا پیغام استعمار مخالف بیانیے کو نئی جہت دیتا ہے۔ جس کی سب سے بڑی مثال علامہ اقبال کی شاعری ہے۔ انہوں نے نہ صرف مغربی تہذیبی بالادستی پر تنقید کی بلکہ ایک متبادل فکری بیانیہ بھی دیا جس میں خودی، آزادی اور دینی و تہذیبی شعور کی بازیافت کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ اس لئے اردو ادب میں کلاسیکی اور جدید عناصر کا ایک ایسا امتزاج سامنے آیا جو آج تک اس کی فکری جہتوں میں محسوس کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی(۱۰)

اقبال اس شعر میں سامراج کی اصل چال کو بے نقاب کرتے ہیں کہ اس نے مسلمانوں کو محض ظاہری روایتوں اور جمود میں الجھا دیا ہے۔ امت نے تمدن، تصوف، شریعت اور کلام کو مقصد بنانے کی بجائے رسم و رواج کا بت بنالیا۔ اس طرح وہ اپنی اصل روح اور عملی قوت کھو بیٹھے ہیں۔ سامراج کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اس نے مسلمانوں کو اندر سے مفلوج کر کے ان کے اندر بیداری، خودی اور عمل کا جذبہ ختم کر دیا تاکہ وہ غلامی کو ہی اپنی تقدیر سمجھنے لگیں لیکن اقبال کی شاعری ایک بہترین مظہر ٹھہری جس نے استعماریت کے زیر اثر ذہنی غلامی کے خلاف بغاوت اور خودی کی بازیافت کا نعرہ بلند کیا گیا۔ وہ لکھتے ہیں:

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا(۱۱)

اقبال اس شعر میں مغربی تہذیب اور استعمار پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقت کھولتے ہیں کہ جس میں تعلیم، صحت اور انسانی محنت تک کو منڈی کا مال بنا دیا گیا ہے۔ پھر وہ استعمار کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مغربی طاقتوں نے اپنی تہذیب کو "کھرا سونا" سمجھتے ہوئے صدیوں تک نو آبادیات قائم کر کے اس خطے کو لوٹا اور دوسری اقوام پر اپنی برتری قائم رکھی۔ وہ عالمی سیاست کی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ بڑی طاقتیں اور عالمی ادارے انسانیت کے نام پر بڑے بڑے فیصلے تو کرتے ہیں مگر ان کے پس

منظر میں صرف طاقت اور معیشت کا کھیل کھیلا اور اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ اقبال یہ پیغام دیتے ہیں کہ جس ترقی اور تہذیب کو دنیا اصلی سمجھ رہی ہے وہ دراصل کھوٹا سکہ ہے کیونکہ اس میں روحانیت، اخلاق اور عدل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چمک دمک عارضی ہے۔ اس طرح اردو ادب نو آبادیاتی دور میں نہ صرف نئی اصناف سے آشنا ہوا بلکہ اپنے فکری ڈھانچے کو بھی تبدیل کرنے پر مجبور ہوا۔ یہ تبدیلیاں آج بھی اردو ادب کی ساخت اور اسلوب میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ جہاں ادب صرف تفریحی اظہار نہیں رہتا بلکہ آزادی، خودداری اور مزاحمت کا ایک فکری و انقلابی منشور بن کر سامنے آتا ہے۔ اس تناظر میں ان کی شاعری ایک ایسے منشور کی حیثیت رکھتی ہے جو مغربی استعمار کے خلاف فکری آزادی اور تہذیبی خود مختاری کی جدوجہد کو نئے خطوط پر استوار کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں(۱۲)

اقبال مسلمانوں کی بے حسی اور جمود پر افسوس کرتے ہیں کہ وہ استعمار کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں لیکن بیداری کی لہر ان میں پیدا نہیں ہو رہی۔ غلام قوم سمندر کی موجوں کی طرح پر سکون ہو جاتی ہے جس میں حرکت اور قوت باقی نہیں رہتی۔ اقبال دعا کرتے ہیں کہ کوئی بڑا طوفان اٹھے جو استعمار کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر مسلمانوں کو حرکت، آزادی اور خودداری دے۔ اقبال کی شاعری میں استعمار مخالف یہ مزاحمتی بیانیہ ان کی نمایاں نظموں اور خطبات میں واضح طور پر جھلکتا ہے۔ ان کی نظمیں شکوہ اور جوابِ شکوہ امتِ مسلمہ کو زوال کے اندھیروں سے نکال کر تجدیدِ ایمان اور فکری آزادی کی طرف بلاتی ہیں جبکہ طلوعِ اسلام ایک امید افزا نغمہ ہے جو محکوم اقوام کے لیے بیداری کی صدا بنتی ہے۔ اسی طرح اقبال نے مغربی فکر اور نو آبادیاتی جدیدیت کے سحر کو توڑنے کے لیے اسلامی فلسفے کو عصری تناظر میں نئے معانی دینے کی کوشش کی۔ ان کے خطبات میں بھی یہی مزاحمتی رویہ جھلکتا ہے۔ جہاں وہ مذہب کو جامد روایت کی بجائے ایک زندہ قوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جو استعمار کے ذہنی اور روحانی تسلط کو توڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اقبال کی فکر استعمار کے خلاف ایک ایسا نظریاتی بیانیہ تشکیل دیتی ہے جو غلامی کی تاریکی میں روشنی اور خودی کے فقدان میں امید کا پیغام بن جاتی ہے۔

علامہ محمد اقبال نے سرسید کے برعکس نو آبادیاتی فکر اور مغربی تہذیب کے تسلط کو کھلے عام چیلنج کیا۔ اقبال کے نزدیک مغربی استعمار نے برصغیر کے مسلمانوں کو نہ صرف سیاسی غلام بنایا بلکہ ذہنی اور روحانی سطح پر بھی محکوم کر دیا۔ انہوں نے اپنی شاعری اور فلسفے کے ذریعے اس غلامی کے خلاف مزاحمت کی ایک فکری بنیاد رکھی۔ ان کا مشہور تصور "خودی" فرد اور قوم دونوں کے لیے آزادی اور خودداری کا استعارہ بنا۔ اقبال نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ وہ اپنی اصل تہذیبی میراث کی طرف لوٹیں اور مغربی جدیدیت کی بجائے اسلامی فکر سے رہنمائی حاصل کریں۔ "جاوید نامہ"، "ضربِ کلیم" اور "طلوعِ اسلام" اس بات کی مثالیں ہیں کہ کس طرح اردو ادب استعمار کے خلاف ایک فکری محاذ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اقبال نے نہ صرف مسلمانوں کو ماضی کی عظمت یاد دلائی بلکہ انہیں مستقبل کے لیے ایک نئی سوچ دی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان استعمار کے ذہنی اور تہذیبی جبر سے آزاد ہو کر اپنی کھوئی ہوئی شناخت دوبارہ حاصل کریں۔ اس طرح جہاں سرسید کا بیانیہ نو آبادیاتی نظام کے ساتھ مفاہمت پر مبنی تھا جبکہ اقبال کا بیانیہ مزاحمتی فکر، آزادی اور خودی کی

بازیافت پر مبنی تھا۔ یہ دو دھارے اردو ادب میں ایک دوسرے کے متوازی چلتے ہیں اور استعمار اور ادب کے تعلق کو دو مختلف زاویوں سے واضح کرتے ہیں۔

اردو ادب میں مابعد نو آبادیاتی جہت آزادی کے بعد مزید نمایاں ہوئی۔ نو آبادیاتی بیانیہ اور ردِ استعماریت اردو ادب کو ایک ایسا تنقیدی زاویہ فراہم کرتے ہیں جو اسے مزاحمت، آزادی اور نئی شناخت کی جستجو کا آئینہ بناتا ہے۔ نو آبادیاتی جبر کے خلاف سب سے زیادہ انقلابی اور تخلیقی اظہار فیض احمد فیض نے کیا۔ ان کی شاعری میں مزاحمت صرف بیرونی استعمار تک محدود نہیں رہتی بلکہ آزادی کے بعد کے سماجی ڈھانچوں اور طبقاتی ناہمواریوں تک پھیل جاتی ہے۔ فیض نے مظلوم عوام، محنت کشوں اور کسانوں کی محرومیوں کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا اور یہ دکھایا کہ استحصال یا ظلم صرف بیرونی سامراجی طاقتوں کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ یہ مقامی معاشرتی اور طبقاتی نظام کی وجہ سے بھی جاری رہتا ہے۔ یعنی طاقت اور وسائل پر قبضہ رکھنے والے مقامی طبقے بھی عوام یا کمزور طبقات کا استحصال کرتے ہیں جس سے ظلم و زیادتی کا سلسلہ برقرار رہتا ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق نظم "صبحِ آزادی" اسی تلخی کو بیان کرتی ہے کہ محض سیاسی آزادی کافی نہیں بلکہ اصل آزادی تب ہوگی جب معاشرتی، فکری اور معاشی جبر سے نجات حاصل ہوگی۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں[۱۳]

فیض آزادی کے لمحے کو "داغ داغ اُجالا" اور "شب گزیدہ سحر" کہتے ہیں۔ یہاں "شب" استعمار اور غلامی کی رات ہے اور "سحر" آزادی کی صبح۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ صبح ادھوری ہے کیونکہ سامراجی جبر کے ڈھانچے ابھی باقی ہیں۔ عوام کو جو خواب دکھائے گئے تھے وہ ابھی پورے نہیں ہوئے۔ فیض کا بیانیہ امید، جدوجہد اور انقلابی رومانیت کو یکجا کر کے عوامی شعور کو جگانے اور استحصالی نظام پر کاری ضرب لگانے کی ایک ادبی و فکری کوشش بن جاتا ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں مزاحمتی لہجہ احتجاجی نعروں تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک فکری اور جمالیاتی روشنی رکھتا ہے۔ ان کی نظموں اور شعری لہجے میں رومان اور انقلاب کی ایسی آمیزش ملتی ہے جو قاری کو نہ صرف استعمار کی بیرونی شکل کے خلاف کھڑا کرتی ہے بلکہ آزادی کے بعد باقی رہ جانے والے معاشرتی و ذہنی ڈھانچوں کو بھی چیلنج کرتی ہے۔ "دستِ صبا" اور دیگر نظمیں استحصالی نظام پر طنز کے ساتھ ساتھ عوامی بیداری کی تحریک بھی ہیں۔ فیض کا یہ مزاحمتی رویہ عالمی سامراج کے خلاف احتجاج کی شکل بھی اختیار کرتا ہے جس نے انہیں تیسری دنیا کے عوامی شعور کا نمائندہ بنا دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو، لب کھولو چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا کچھ دور تو نالے جائیں گے[۱۴]

یہ اشعار استعمار اور اس کے جبر کے خلاف جدوجہد کی علامت ہیں۔ فیض مظلوم عوام کو حوصلہ دیتے ہیں کہ اگر راستے میں قربانیاں دینا پڑیں تو بھی سفر آزادی ترک نہ کریں۔ وہ بتاتے ہیں کہ سر اور بازو بہت ہیں یعنی قربانی دینے والے کم نہیں۔ اس لیے قافلہ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 02, December 2025

رکے گا نہیں۔ آخر کار یہ جدوجہد اپنی منزل یعنی استعمار سے حقیقی نجات پر جا کر رکے گی۔ وہ جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کی دعوت ہے۔ فیض کہتے ہیں کہ مظلوم اگر خاموش رہے تو ظلم بڑھتا ہے مگر جب وہ بولتے ہیں تو یہی آوازیں استعمار کے خلاف بغاوت کا طوفان بن جاتی ہیں۔ اس طرح فیض نے اردو ادب میں استعمار مخالف روایت کو طبقاتی جدوجہد، عالمی انصاف اور فکری آزادی سے جوڑ کر ایک نئے تنقیدی و جمالیاتی افق تک پہنچا دیا۔ یہی وہ جہت ہے جو فیض اور منٹو کو ایک مشترکہ دھارے میں لا کھڑا کرتی ہے۔ اس لیے اردو ادب نہ صرف نو آبادیاتی بیانیے کی مزاحمت کرتا ہے بلکہ آزادی کے بعد کے تضادات اور بحرانوں کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی انقلابی شاعری میں استعمار کی سازشوں اور چالوں کو بے نقاب کیا اور عوام کو بیداری و مزاحمت کا پیغام دیا۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے غلامی کے خلاف للکار اور آزادی کے حق میں حوصلہ افزائی کی علامت بنے:

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں(۱۵)

یہ شعر استعمار مخالف جوش اور ولولے کی عکاسی کرتا ہے۔ شاعر مظلوموں اور غلاموں کو پکار کر کہتا ہے کہ جبر و غلامی کی دیواریں ہل رہی ہیں اور زنجیریں ٹوٹنے کو ہیں اس لیے اب بیدار ہو کر جدوجہد کا آغاز کرو۔ اس میں آزادی کی قریب آتی ہوئی صبح کی خوشبو اور استعمار کے کمزور پڑتے ہوئے نظام کی تصویر نظر آتی ہے۔ گویا شاعر یہ پیغام دیتا ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ غلامی کے حصار کو توڑ کر آزادی حاصل کی جائے۔ جوش کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" استعمار (Colonialism) کے خلاف ایک زبردست شعری اعلان ہے۔ اس میں شاعر نے برطانوی استعمار کی منافقت، ظلم اور دوغلی اخلاقیات کو کچھ اس طرح بے نقاب کیا ہے:

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم،
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں،
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
کل یزید و شمر تھے، اور آج بنتے ہو حسین،
خیر اے سوداگرو! اب ہے تو بس اس بات میں(۱۶)

جوش کی یہ نظم برطانوی استعمار کے خلاف ایک بھرپور فکری احتجاج ہے۔ شاعر نے اس میں سامراجی طاقتوں کی دوغلی پالیسیوں، سیاسی منافقت اور تاریخی ظلم کو نہایت کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ نظم دوسری جنگِ عظیم کے اس دور میں کہی گئی جب برطانیہ خود کو انسانیت اور انصاف کا علمبردار ظاہر کر رہا تھا مگر اسی وقت ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو ظلم و جبر سے دبایا جا رہا تھا۔ جوش نے اپنے شعری احتجاج کے ذریعے اس تضاد کو نمایاں کیا کہ جو قومیں انصاف اور امن کی بات کرتی ہیں وہی کمزور اقوام کی غلامی کو

برقرار رکھنے میں سب سے آگے ہیں۔ اس نظم میں ردِ استعماریت (Decolonialism) کا بیانیہ پوری قوت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ شاعر نے جھانسی، سراج الدولہ، جلیانوالہ باغ اور بھگت سنگھ جیسے تاریخی واقعات کو یاد دلا کر برطانوی سامراج کو اس کے اپنے ماضی کے جرائم کے سامنے لا کھڑا کیا۔ نظم کا مرکزی پیغام یہ ہے کہ انسانیت کا نام لینے والے دراصل انسانیت کے سب سے بڑے مجرم ہیں اور تاریخ ان کے ظلم کی گواہ ہے۔

اقبال کے فلسفیانہ اور فیض کے انقلابی بیانیے کے ساتھ سعادت حسن منٹو کی نثر اردو ادب میں استعمار اور اس کے بعد پیدا ہونے والے حالات کے خلاف ایک الگ ہی جہت فراہم کرتی ہے۔ منٹو نے اپنی افسانہ نگاری کے ذریعے نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی معاشرے کی بے حسی، تشدد، جنسی جبر اور اخلاقی انحطاط کو نہایت جرات کے ساتھ بے نقاب کیا۔ ان کے افسانے محض ادبی تخلیق نہیں بلکہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس دور کے انسان کے نفسیاتی انتشار اور وجودی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کی حقیقت پسندانہ تحریریں مزاحمت کی وہ شکل ہیں جو بلند بانگ نعروں یا نظریاتی مباحث کی بجائے فرد کی روزمرہ زندگی کے کرب اور معاشرتی شکست و ریخت کو نمایاں کرتی ہیں اور وہ اس بات کی وضاحت بھی کرتے ہیں کہ کس طرح استعمار نے برصغیر کے معاشرتی اور تہذیبی ڈھانچے کو بکھیر کر رکھ دیا اور آزادی کے نام پر برصغیر کو مزید زخم دے گیا۔ منٹو کی نثر استعمار کے خلاف ایک خاموش اور نہایت طاقتور احتجاج بن کر آج بھی اپنی معنویت کے اعتبار سے زندہ اور فکر انگیز ہے۔

اردو افسانے میں سعادت حسن منٹو نے استعماریت کے انسان دشمن اثرات کو سب سے زیادہ شدت اور بے باکی سے بے نقاب کیا۔ ان کا افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ایک علامتی افسانہ ہے جو نو آبادیاتی سیاست کے بطن سے جنم لینے والی تقسیم، انسانیت کی پامالی اور نفسیاتی المیوں کا آئینہ ہیں۔ ان کے بیانیے میں نو آبادیاتی طاقتوں کے فیصلے، سرحدوں کی مصنوعی تقسیم اور اس کے نتیجے میں انسان کی بے قدری کو نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ منٹو کا افسانوی ادب براہِ راست مزاحمت کی صورت اختیار کرتا ہے اور استعماریت کے پسِ پردہ موجود طاقت کے ڈھانچوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کا بیانیہ استعمار اور تقسیم کے پیدا کردہ نفسیاتی و سماجی المیوں کو بھی پوری شدت سے سامنے لاتا ہے۔ ان کا افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ استعمار کے کھینچے گئے مصنوعی جغرافیائی اور فکری خلیجوں سے پیدا ہونے والے شناختی بحران کی علامتی تصویر ہے۔ استعماریت کے پیدا کردہ بٹوارے کی المناک داستان، انسانی شناخت اور وجود تک کو بے معنی بنا دیتی ہیں۔

منٹو کا افسانہ "کھول دو" استعماریت کے پس منظر میں تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والی المناک صورتِ حال کی جھلک ہے۔ استعمار نے برصغیر کو اس انداز سے تقسیم کیا کہ سرحدیں کھینچنے کے ساتھ ساتھ انسانی قدریں بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئیں۔ اس افسانے میں ایک بیٹی کی عصمت دری دراصل اس اجتماعی سانحے کی علامت ہے جو نو آبادیاتی پالیسیوں اور ان کے نتیجے میں ہونے والے فسادات نے جنم دیا۔ عورت کو یہاں نہ صرف ذاتی بلکہ سیاسی اور سماجی طاقتوں کی کشمکش کا سب سے بڑا شکار دکھایا گیا ہے۔ استعمار کے بچھائے ہوئے نقشے نے لاکھوں انسانوں کو دربدر کیا اور انسانی رشتے پامال ہوئے۔ استعماریت کے اثرات زمینوں کی تقسیم تک محدود نہیں

رہے بلکہ یہ انسان کی روح، عزت اور حرمت کو بھی مجروح کر گئے۔ یہ کہانی تقسیم کے زخموں اور استعمار کے تباہ کن اثرات کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

منٹو کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" استعماریت اور تقسیمِ ہند کے نتیجے میں جنم لینے والی وحشت اور درندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ نو آبادیاتی تقسیم نے انسان کو اس حد تک سفاک بنا دیا کہ وہ اپنے جذبات اور اعمال پر قابو نہ رکھ سکا۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک قتل اور عصمت دری کی واردات کے ذریعے اس ذہنی و اخلاقی پستی کی نمائندگی کرتا ہے جو تقسیم کے فسادات میں عام ہو چکی تھی۔ استعمار کی کھینچی ہوئی سرحدی لکیروں نے نہ صرف زمینوں کو بانٹا بلکہ انسانوں کے دل بھی تقسیم کر دیے۔ یہ کہانی حیوانیت کی علامت ہے جو سیاسی فیصلوں کے نتیجے میں انسانی وجود پر مسلط ہوئی۔ منٹو نے اس افسانے میں دکھایا کہ استعماریت کے پیدا کردہ حالات نے انسان سے اس کی انسانیت چھین لی اور وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے خون اور عصمت سے کھیلنے پر آمادہ ہو گیا۔ منٹو کا بیانیہ صرف نو آبادیاتی جبر کے خلاف احتجاج ہی نہیں بلکہ مابعد نو آبادیاتی معاشرے میں قائم ہونے والے ظلم اور انحطاط کے خلاف بھی ایک فکری مزاحمت ہے جو اردو افسانے میں ردِ استعماریت اور مابعد نو آبادیاتی بیانیے کی ایک طاقتور مثال بن جاتی ہے۔

اردو فکشن کی تاریخ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ناول "فسانۂ آزاد" ایک غیر معمولی مقام رکھتا ہے۔ یہ تخلیق اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ اردو قارئین کو مغربی طرز کے ناول سے متعارف کرایا۔ اس ناول میں صرف واقعاتی رنگ ہی نہیں بلکہ معاشرتی زندگی کی جھلکیاں، حقیقت نگاری اور طنزیہ اسلوب بھی نمایاں ہیں۔ سرشار نے "فسانۂ آزاد" میں اپنے عہد کے سماجی مسائل، طبقاتی ناہمواری اور تہذیبی کمزوریوں پر روشنی ڈالی اور قاری کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ ادب تفریح سے بڑھ کر معاشرتی شعور بیدار کرنے کا ایک مؤثر وسیلہ ہے۔ یہی پہلو اس ناول کو اردو کے ابتدائی ناولوں میں ایک سنگِ میل اور ادبی روایت میں نئی راہیں متعین کرنے والی تخلیق بنا دیتا ہے۔

پریم چند کا فکشن برطانوی استعمار کے خلاف ادبی مزاحمت اور عوامی بیداری کی علامت ہے۔ ان کے کردار کسان، مزدور اور نچلے طبقے کے عام لوگ ہوتے ہیں اور وہ ان کے ذریعے ظالمانہ نظام کی حقیقت آشکار کرتے ہیں جو انسان کو معاشی غلامی اور اخلاقی زوال میں مبتلا کرتی ہے۔ ان کے افسانے کفن، سوجی، پوس کی رات اور نیا قانون حقیقت کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں جن میں قانون، مذہب اور اخلاقیات کو سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال ہوتے دکھایا گیا ہے۔ پریم چند کے نزدیک کہانی تفریح نہیں بلکہ شعور اور بیداری کا ذریعہ ہے۔ "نیا قانون" میں انہوں نے استعماری عدل کی منافقت کو نمایاں کیا جہاں قانونی تبدیلی کے باوجود جبر کا ڈھانچہ برقرار رہتا ہے جبکہ "کفن" اور "پوس کی رات" میں غربت، بھوک اور غلامی سامراجی حکمت عملی کا واضح ثبوت ہے۔ ان کی مزاحمت شورش خیز نہیں بلکہ خاموش، اخلاقی اور فکری سطح پر اتنی گہری ہے کہ قاری کو بغاوت اور آزادی کے احساس سے روشناس کراتی ہے۔ پریم چند کا فن اردو فکشن میں ردِّ استعماریت کی فکری بنیاد قائم کرتا ہے۔

اردو کے ترقی پسند تحریک کے ابتدائی لکھاریوں میں سجاد ظہیر کا نام نمایاں ہے۔ ان چار ادیبوں کا افسانوی مجموعہ "انگارے" 1932ء میں شائع ہوا۔ یہ افسانوی مجموعہ نو آبادیاتی دور کے معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر کو بڑے عمدہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ استعمار

کے زیرِ اثر ایک ایسا طبقاتی ڈھانچہ وجود میں آتا ہے جس میں ہر شخص اپنے سے نیچے والے کو دبانے اور اوپر والے کے آگے جھکنے پر مجبور ہے۔ منشی برکت علی: جو خود افسر شاہی کے ظلم اور ناانصافی کے ستائے ہوئے ہیں اور اپنے ہی جیسے غریب جمن کی فریاد سننے کو تیار نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انگریز اور بڑے افسران کے ظلم کا نشانہ وہ خود بھی ہیں۔ وہ مقامی استعمار کا لبادہ اوڑھ کر جمن سے بہانہ بنا کر پیچھا چھڑاتے ہیں اور اس کی دادرسائی کے لیے مدد کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ یہاں افسانہ دکھاتا ہے کہ استعمار نے انسان کی سوچ اور کردار کو متاثر کیا۔ محکوم طبقہ محکوم ہی کو مزید محکوم بناتا ہے اور اس سلسلے میں "استعماری ذہنیت" اندر تک سرایت کر جاتی ہے۔ اس طرح معاشرہ دوہری غلامی میں جکڑ جاتا ہے جیسے ایک طرف استعمار کا دباؤ اور دوسری طرف مقامی استعمار کا استحصال اس طرح اسے اپنی ہی مجبوریاں بے بس کر دیتی ہیں۔ سجاد ظہیر نے اپنے افسانوں میں یہ دکھایا کہ کس طرح استعماری طاقت نے مقامی سماج کی خرابیوں اور طبقاتی تضادات کو مزید بڑھاوا دیا۔ ان کی تحریریں سماجی حقیقت نگاری اور استعمار کے اثرات کو بے نقاب کرنے کا بھی ذریعہ بنیں۔

ترقی پسند تحریک کے ممتاز ادیب کرشن چندر نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں نو آبادیاتی معاشرت کی سخت ترین حقیقتوں کو اجاگر کیا۔ ان کا مشہور افسانہ "مہالکشمی کا پل" اس بات کی واضح مثال ہے جس میں ہندوستانی عوام کی محرومی اور استعماری دور کے سماجی تضادات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس تخلیق میں انہوں نے دکھایا کہ پل جیسی تعمیرات اگرچہ جدیدیت کی علامت تھیں لیکن وہ صرف اشرافیہ اور طاقتور طبقوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئیں۔ جب کہ نچلا طبقہ مزید غربت اور استحصال کا شکار ہوتا گیا۔ اسی طرح کرشن چندر کے دیگر افسانوں اور ناولوں میں بھی برطانوی نو آبادیاتی نظام کے تاریک پہلو، معاشی ناانصافی اور محکوم طبقے کی بے بسی کو موضوع بنایا گیا۔ ان کی تحریروں کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ استعمار نے مقامی سماج کی بنیادوں میں غربت، ناانصافی اور طبقاتی تقسیم کو مزید بڑھا دیا اور جسے اردو ادب کے ذریعے اجاگر کرنا ایک مزاحمتی عمل تھا۔

قرۃ العین حیدر اردو فکشن میں ایک ایسا نام ہیں جنہوں نے تاریخ، تہذیب اور نو آبادیاتی تجربات کو ایک ہمہ گیر بیانیے سے جوڑا ہے۔ ان کا شہرہ آفاق ناول "آگ کا دریا" اردو ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول میں برصغیر کی صدیوں پر محیط تاریخ، تہذیبی نشیب و فراز اور ہجرت و شناخت کے مسائل کو اس گہرائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ قاری کو نو آبادیاتی اثرات کے ساتھ ساتھ ماضی اور حال کی تہذیبی شکست و ریخت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے دکھایا کہ کس طرح استعمار نے نہ صرف سیاسی ڈھانچے کو بدلا بلکہ تہذیبی یادداشت اور شخصی شناخت کو بھی شدید بحران سے دوچار کیا۔ "آگ کا دریا" اس اعتبار سے ایک ایسا بیانیہ ہے جو نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی زندگی کے پیچیدہ رشتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

اردو ناول نگاری میں عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" نو آبادیاتی دور کے سیاسی و تہذیبی منظرنامے کی ایک بھرپور عکاسی ہے۔ اس ناول میں 1857ء کی جنگِ آزادی سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے حالات کو نہ صرف تاریخی حوالوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے بلکہ نو آبادیاتی دباؤ اور عوامی مزاحمت کے باہمی تصادم کو بھی فنی مہارت سے اجاگر کیا ہے۔ عبداللہ حسین نے اس داستان کو ایک بیانیہ کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اس میں سماجی تبدیلی، طبقاتی تقسیم اور قومی شعور کی بیداری کو تنقیدی نظر سے پرکھا ہے۔ "اداس نسلیں" کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں فرد اور معاشرے کے باہمی رشتے کو دکھایا گیا ہے. کس طرح ایک فرد کی جدوجہد پورے عہد کی

اجتماعی صورتحال سے مربوط ہے۔ یہ ناول دراصل استعمار کے زیرِ سایہ جینے والے معاشرے کی داخلی کشمکش اور آزادی کے خواب کی علامتی تصویر ہے۔ اسی وجہ سے عبداللہ حسین کو اردو فکشن میں ایسے تخلیق کار کے طور پر دیکھا جاتا ہے جنہوں نے نو آبادیاتی فضا اور اس کے اثرات کو نہایت باریک بینی سے تنقید اور فن دونوں سطحوں پر پیش کیا۔

اردو فکشن میں انتظار حسین کی تخلیقات مابعد نو آبادیاتی مباحث کے حوالے سے نہایت اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے افسانے اور ناول شناخت کے بحران، روایت کی بازیافت اور مزاحمت کے متنوع پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ "بستی" ایسی تخلیق ہے جس میں ہجرت کا المیہ اور نو آبادیاتی اثرات کی گونج پوری شدت سے سنائی دیتی ہے۔ انتظار حسین کے ہاں آزادی کے بعد کا منظر نامہ محض سیاسی نجات کا بیانیہ نہیں بلکہ ایک گہرا تہذیبی اور نفسیاتی خلا ہے جو استعمار کے ماضی سے مسلسل جڑا ہوا ہے۔ ان کے افسانے اس نکتے کو نمایاں کرتے ہیں کہ نو آبادیاتی اقتدار سیاسی طور پر ختم ہو چکا تھا مگر ذہنی و تہذیبی سطح پر اس کے اثرات نے شناخت، تاریخ اور ثقافتی تسلسل کو منقطع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ "بستی" میں ہجرت، جلاوطنی اور تہذیبی زوال کے تجربات کو ایک علامتی اور داستانوی اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔

"شہر افسوس" ایک ایسا نوحہ ہے جس میں نو آبادیاتی سیاست نے تقسیم ہند کے سانحے کو جنم دیا اور صدیوں پرانی تہذیبی رشتوں کو منقطع کر دیا۔ انتظار حسین نے اپنے علامتی اور داستانوی اسلوب کے ذریعے یہ دکھایا کہ ہجرت کا صدمہ اور ماضی سے وابستگی کی خواہش دراصل اسی تاریخی عمل کا ردِ عمل ہے جس نے مقامی تہذیبی شناخت کو مسخ کر ڈالا۔ اس طرح ان کی تخلیقات مابعد نو آبادیاتی فکر کی توانا آوازیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ استعمار کے اختتام کا مطلب صرف سیاسی آزادی نہیں تھا بلکہ اس نے ذہنی، فکری اور روحانی سطح پر مسلسل بحران پیدا کیا جس کی بازگشت آج بھی اردو ادب میں سنائی دیتی ہے۔ سعادت حسن منٹو اور انتظار حسین دونوں کے ہاں اردو افسانہ استعماریت کے خلاف مزاحمت اور مابعد نو آبادیاتی عہد کے فکری و تہذیبی بحران کا بیانیہ بن کر سامنے آتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ منٹو نے براہِ راست حقیقت نگاری کے ذریعے استعمار اور تقسیم کے زخموں کو دکھایا ہے۔ لیکن انتظار حسین نے علامت اور داستانوی فضا کے ذریعے استعماریت کے مابعد اثرات کو اجاگر کیا۔ یہ وہ امتزاج ہے جس نے اردو افسانے کو نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی تناظر میں ایک نہایت گہری اور معنوی جہت عطا کی۔

اردو ادب میں استعمار اور رد استعماریت کا مطالعہ دراصل اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ادب جمالیاتی سرگرمی کے ساتھ ایک عہد کی فکری، تہذیبی اور سماجی صورتِ حال کا بھی اظہار ہے۔ استعمار کے دور میں اردو ادب نے سامراجی تسلط کو ایک خارجی دباؤ کی حیثیت سے نہیں سمجھا اسے انسانی آزادی، خود مختاری اور تہذیبی وقار کے مسئلے کے طور پر پیش کیا۔ اسی لیے اقبال کے افکار میں خودی کا پیغام اور فیض کی شاعری میں انقلابی مزاحمت کا رنگ نظر آتا ہے جبکہ منٹو، پریم چند، قرۃ العین ڈپٹی نذیر احمد اور عبداللہ حسین کی نثر میں محکوم انسان کی بے بسی اور اس کے ردِ عمل کی جھلک ملتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ادب نے استعمار کے مقابلے میں احتجاجی اور انقلابی بیانیہ تشکیل دینے کے ساتھ ایک ایسا فکری زاویہ بھی فراہم کیا جس میں محکوم انسان اپنی شناخت کو از سرِ نو دریافت کرتا

ہے۔ استعماریت کے خلاف ادبی مزاحمت ایک طرح کا فکری تحرک تھا جس نے اردو ادب کو عالمی سطح پر مزاحمتی ادب کے اہم دھارے میں شامل کیا۔

ردِاستعماریت کے زاویے سے دیکھا جائے تو اردو ادب نے آزادی کے بعد پیدا ہونے والے نئے مسائل کو بھی اپنے دائرہ اظہار میں شامل کیا۔ عصرِ حاضر کا ادبی منظر نامہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ سامراجی فکر اور ادارے بظاہر ختم ہو جانے کے باوجود بھی ذہنی و فکری سطح پر ان کی باقیات اب بھی موجود ہیں۔ مابعد نو آبادیاتی ادب میں یہ سوال بار بار اٹھایا گیا کہ حقیقی آزادی کس طرح حاصل ہو گی اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔ اردو ادب نے اس تناظر میں نہ صرف نو آبادیاتی ذہنیت کو بے نقاب کیا بلکہ ایک ایسا تنقیدی شعور بھی دیا جس کے ذریعے قاری اپنی فکری اور تہذیبی خود مختاری کا احساس کر سکے۔ یوں استعمار اور ردِاستعماریت کا یہ ادبی مطالعہ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ ادب ماضی کو محفوظ رکھنے، حال کو سمجھنے اور مستقبل کے امکانات کو متعین کرنے کا طاقتور وسیلہ ہے۔ اردو ادب اسی تسلسل میں ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ آزادی کی اصل روح فکری خود مختاری، تہذیبی وقار اور انسانی مساوات کی بازیافت سے وابستہ ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ایڈورڈ سعید ڈبلیو، شرق شناسی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲

۲۔ ایضاً، ص ۱۴

۳۔ سی ایل انس، دی کیمبرج انٹروڈکشن ٹو پوسٹ کلونیل لٹریچر ان انگلش، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲

۴۔ فرانز فینن، افتادگان خاک، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۷۳

۵۔ میر انیس، مراثی انیس، جلد دوم، نول کشور پریس، لکھنو، ۱۸۹۰ء۔ ن د

۶۔ میر ببر علی انیس، انتخابِ مراثی انیس، مرتبہ: آلِ احمد سرور، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء

۷۔ اکبر الہ آبادی، رباعی: یہ بات غلط کی دارالاسلام ہے ہند، اردو رباعیات میں ہندوستانی عناصر، ص ۱۲۷

۸۔ اکبر الہ آبادی، کلیاتِ اکبر، جلد دوم، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ص ۱۱۲

۹۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۱۰۔ اقبال، علامہ محمد، کلیات: بال جبرائیل، ساقی نامہ، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز لاہور، ص ۵۲۳

۱۱۔ اقبال، علامہ محمد، کلیات: بانگ درا، حصہ دوم غزلیات: زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، مارچ ۱۹۰۷ء ص ۱۶۹

۱۲۔ اقبال، علامہ محمد، کلیات: ضرب کلیم، تعلیم و تربیت، طالب علم، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، ص ۶۸۸

۱۳۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا: دست صبا، صبح ازادی، کارواں پریس، لاہور، ص ۱۱۶

۱۴۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا: دست صبا، ترانہ، کارواں پریس، لاہور، ص ۱۳۸

۱۵۔ جوش ملیح آبادی، شعری مجموعہ: شعلہ و شبنم، نظم، شکست زنداں کا خواب، ہمالیہ بک ہاؤس، دہلی، ص ۶۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۶۷

References in Roman Script:

1. Saeed, Edward W, Sharq Shanasi, Muqtadra Qaumi Zabaan, Islamabad, 2012, p. 12
2. Ibid, p. 14
3. C. L. Innes, The Cambridge Introduction to Postcolonial Literature in English, Cambridge University Press, Cambridge, 2007, p. 12
4. Fanon, Frantz, Iftadagān-e-Khaak, Fiction House, Lahore, 2017, p. 173
5. Mir Anis, Marasi-e-Anis, Jild Duvum, Naval Kishore Press, Lucknow. 1890
6. Mir Babbar Ali Anis, Intikhab-e-Marasi-e-Anis, Murattiba: Aal-e-Ahmad Sarwar, Sang-e-Meel Publications, Lahore. 1985
7. Akbar Allahabadi, Rubai: Yeh Baat Ghalat Ki Dar-ul-Islam Hai Hind, In Urdu Rubaiyat mein Hindustani Anasir, n.d, p. 127.
8. Akbar Allahabadi, Kulliyat-e-Akbar, Jild Duvum, Murattiba: Naval Kishore, Lucknow, n.d, p. 112.
9. Ibid
10. Iqbal, Allama Muhammad, Kulliyat: Bal-e-Jibril, Saqi Nama, Sheikh Muhammad Bashir & Sons, Lahore, n.d, p. 523.
11. Iqbal, Allama Muhammad, Kulliyat: Bang-e-Dra, Hissa Duvum, Ghazliyat: Zamana Aaya Hai Be-Hijabi Ka, Sheikh Muhammad Bashir & Sons, Lahore, 1907, p. 169.
12. Iqbal, Allama Muhammad, Kulliyat: Zarb-e-Kalim, Taleem o Tarbiyat, Talib-e-Ilm, Sheikh Muhammad Bashir & Sons, Lahore, n.d, p. 688.
13. Faiz, Ahmad Faiz, Nuskha Haa'e Wafa: Dast-e-Saba, Subh-e-Azadi, Caravan Press, Lahore, n.d, p. 116.
14. Faiz, Ahmad Faiz, Nuskha Haa'e Wafa: Dast-e-Saba, Tarana, Caravan Press, Lahore, n.d, p. 138.
15. Josh Malihabadi, Sha'ri Majmu'a: Shola-o-Shabnam, Nazm: Shikast-e-Zindan ka Khwab, Himalaya Book House, Delhi, n.d, p. 67
16. Ibid, p. 67

Dr. Syed Zahid Hussain Kazmi is serving as the Vice Principal at Islamabad Model College for Boys, I-10/1, Islamabad. He holds a PhD from National University of Modern Languages, Islamabad, Pakistan and specializes in Urdu Criticism and Urdu Research & Editing. He has four published research articles to his credit. His honors include a Merit Certificate from the President of Pakistan along with numerous awards recognizing his excellence in the field of education.